ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 3920

Program: BS (Seerat Studies)

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ (شعبہ سیرت سٹڈیز)

کورس: تعارف علوم اسلامیہ دوم (3920) • سطح: بی ایس (سیرت سٹڈیز)

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 2 (یونٹ: 5-9)

کل نمبر: 100 • کامیابی کے نمبر: 50

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

Reference &For Study — SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، تصورات کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں لکھیں۔ اس گائیڈ کو ہو بہو نقل کرنے کے بجائے اپنی فہم کے مطابق تحریر کریں۔ جہاں کسی دینی یا قانونی مسئلے میں قطعی رائے درکار ہو وہاں اہلِ علم اور مستند علماء کی طرف رجوع کریں۔

سوال نمبر 1: خلافت کا تصور اور خلفائے راشدین کا طرزِ حکمرانی

سوال نمبر 1: خلافت کے تصور کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے خلفائے راشدین کے طرزِ حکمرانی میں مشاورت، عدل، احتساب، عوامی فلاح اور حکمران کی ذمہ داری کے اصولوں کا جائزہ لیں۔ (20 نمبر)

تعارف

خلافت اسلامی سیاسی فکر کا مرکزی تصور ہے جس سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت کی دینی و دنیوی قیادت کا وہ نظام ہے جو قرآن و سنت کی رہنمائی میں عدل، مشاورت اور عوامی فلاح پر قائم ہو۔ خلفائے راشدین یعنی حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہم کا دور اس تصور کی عملی اور مثالی صورت سمجھا جاتا ہے، کیونکہ اس دور میں اقتدار کو ذاتی جاگیر کے بجائے امانت سمجھا گیا۔ اس سوال میں پہلے خلافت کے تصور کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا جائے گا اور پھر خلفائے راشدین کے طرزِ حکمرانی میں مشاورت، عدل، احتساب، عوامی فلاح اور علما کی ذمہ داری کے اصولوں کا منظم جائزہ لیا جائے گا۔ اس مطالعے کی اہمیت آج بھی ہے، کیونکہ حکمرانی کے یہ اصول ہر دور کے لیے رہنما ہیں۔

خلافت کا تصور: مفہوم و بنیادیں

لفظِ خلافت خلف سے ہے جس کے معنی بعد میں آنے اور نیابت کے ہیں۔ اسلامی اصطلاح میں خلیفہ سے مراد وہ حکمران ہے جو اللہ کے احکام کی روشنی میں عوام کے امور کی نگرانی کرے اور شریعت کے نفاذ و عدل کے قیام کا ذمہ دار ہو۔ قرآن مجید میں حضرت آدم علیہ السلام کو زمین میں خلیفہ کہا گیا ہے (مفہوم: سورۃ البقرہ، آیت 30)، جس سے نیابت اور ذمہ داری کا تصور واضح ہوتا ہے، اور حضرت داؤد علیہ السلام کو یہ ہدایت دی گئی کہ وہ لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کریں (مفہوم: سورۃ ص، آیت 26)۔ سیاسی خلافت کا مفہوم ان بنیادوں سے مل کر یہ بنتا ہے کہ حکمران مطلق العنان بادشاہ نہیں بلکہ قانونِ الٰہی اور عوام کے سامنے جواب دہ امین ہے۔ امام ماوردی اور دیگر اہلِ علم نے خلافت کی ذمہ داریوں میں دین کی حفاظت، عدل کا نفاذ، سرحدوں کی حفاظت اور عوام کے حقوق کی نگرانی کو شامل کیا ہے۔ اس تصور میں اقتدار کا ماخذ نہ وراثت کا خودکار حق ہے اور نہ محض طاقت، بلکہ بیعت و مشاورت کے ذریعے امت کا اعتماد ہے، اور اقتدار کا مقصد خدمت ہے نہ کہ عیاشی۔

تجزیاتی طور پر خلافت کے تصور کی تین نمایاں خصوصیات ہیں۔ پہلی یہ کہ اس میں حاکمیت کا اصل تصور اللہ کی حاکمیت سے جڑا ہے، لہٰذا حکمران خود بھی قانون سے بالاتر نہیں ہوتا۔ دوسری یہ کہ حکمران اور رعایا کے درمیان تعلق حقوق و فرائض کا دوطرفہ معاہدہ ہے، فرمانبرداری اسی وقت واجب رہتی ہے جب حکمران عدل و حق پر قائم رہے۔

تیسری یہ کہ اس نظام میں دنیوی حکمرانی کو اخلاقی و روحانی مقصد سے جدا نہیں کیا گیا، اس لیے ظلم کرنے والا حکمران محض بد انتظام نہیں بلکہ امانت میں خیانت کرنے والا سمجھا جاتا ہے۔ خلفائے راشدین کے انتخاب کے طریقے بھی اس تصور کی عملی جھلک ہیں: حضرت ابو بکر کا انتخاب ثقیفہ بنی ساعدہ میں مشاورت سے ہوا، حضرت عمر کو حضرت ابو بکر نے مشاورت کے بعد نامزد کیا، حضرت عثمان کا انتخاب حضرت عمر کی بنائی ہوئی چھ رکنی شوریٰ نے کیا اور حضرت علی کی بیعت اہلِ مدینہ نے کی۔ طریقے مختلف رہے مگر اصول یعنی مشاورت و اعتماد ہر جگہ موجود رہا۔

مشاورت کا اصول

مشاورت خلافتِ راشدہ کی روح تھی۔ قرآن میں اہلِ ایمان کی صفت بیان کی گئی ہے کہ ان کے معاملات باہمی مشورے سے طے ہوتے ہیں (مفہوم: سورۃ الشوریٰ، آیت 38)، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی صحابہ سے مشورہ کرنے کی ہدایت دی گئی (مفہوم: سورۃ آلِ عمران، آیت 159)۔ خلفائے راشدین نے اس اصول کو ادارہ جاتی شکل دی۔ حضرت ابو بکر اہم فیصلوں میں اکابر صحابہ کو جمع کرتے تھے، مانعینِ زکاۃ کے مسئلے پر حضرت عمر کے اختلاف کے باوجود دلیل کی بنیاد پر اپنا موقف واضح کیا اور امت کو تقسیم سے بچایا۔ حضرت عمر نے باقاعدہ مجلسِ شوریٰ قائم رکھی، صوبوں کے گورنروں کی تقرری اور اہم جنگی و مالی فیصلوں میں مشورہ کیا، اور خلیفہ کے انتخاب کے لیے بھی شوریٰ کا نظام چھوڑا۔ حضرت عثمان اور حضرت علی کے دور میں بھی مشاورت اہم رہی، اگرچہ سیاسی افراتفری کی وجہ سے بعض مواقع پر اس کی مؤثر صورت کمزور پڑی، جو خود اس بات کا ثبوت ہے کہ نظام کی خرابی مشاورت کے کمزور ہونے سے شروع ہوتی ہے۔ مشاورت کا فائدہ صرف فیصلے کی بہتری نہیں بلکہ عوام کی شرکت اور اعتماد بھی ہے، اور یہی جدید جمہوری حکمرانی کے تصورِ شرکت سے بھی ہم آہنگ ہے۔

عدل و احتساب کا نظام

عدل خلفائے راشدین کے طرزِ حکمرانی کا سب سے نمایاں وصف تھا۔ حضرت عمر کا عدل تو ضرب المثل بن گیا ہے: ان کے دور میں قاضیوں کو واضح ہدایات دی گئیں کہ مقدمے میں خلیفہ کا رشتہ دار اور عام شہری برابر ہیں۔ تاریخ میں بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت عمر نے اپنے بیٹے کو بھی قانون کی خلاف ورزی پر سزا سے مستثنیٰ نہیں رکھا۔ بیت المال سے

وظائف کی تقسیم میں سابقیتِ اسلام، ضرورت اور عیال داری جیسے معیار رکھے گئے اور خلیفہ نے اپنے لیے وہی معیار رکھا جو عام شہری کا تھا۔ حضرت ابو بکر نے خلیفہ بننے کے بعد اپنا کاروبار چھوڑ دیا اور بیت المال سے صرف ضرورت کے مطابق گزارہ لیا، اور وفات کے وقت اضافی رقم واپس کر دی۔ یہ مثالیں بتاتی ہیں کہ عدل صرف عدالتوں کا نام نہیں بلکہ مالی شفافیت، مواقع کی مساوات اور قانون کے یکساں اطلاق کا جامع نظام ہے۔

احتساب کا اصول عدل کی تکمیل کرتا ہے۔ خلافتِ راشدہ میں حکمران خود بھی احتساب کے دائرے میں تھا اور اہلکار بھی۔ حضرت عمر گورنروں کی تقرری کے وقت ان کے اثاثوں کا ریکارڈ رکھتے، مدتِ کار کے بعد آمدنی میں غیر معمولی اضافے کی تحقیقات کرتے اور شکایت پر اہلکار کو طلب کر کے جواب دہی کرتے۔ عوام کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ خلیفہ سے سوال کرے؛ ایک عام شخص کا حضرت عمر سے ان کے کپڑوں کے بارے میں سوال کرنا اور خلیفہ کا اطمینان بخش جواب دینا اس مزاج کی مشہور مثال ہے۔ حضرت علی نے بھی اہلکاروں کو خطوط میں عوام کے ساتھ نرمی، بیت المال کی حفاظت اور خود نمائی سے بچنے کی سخت ہدایت دیں، جن میں سے کئی تحریریں آج بھی حکمرانی کی اخلاقی دستاویزات میں شمار ہوتی ہیں۔ اس نظام کی خوبی یہ تھی کہ احتساب محض قانونی نہیں بلکہ اخلاقی و عوامی بھی تھا: مسجد کے منبر سے لے کر منڈی کی نگرانی یعنی حسبہ تک، جواب دہی کا ماحول ہر سطح پر موجود تھا۔

جدول 1: خلفائے راشدین کے طرزِ حکمرانی کے اصول — خلاصہ

اصول	عملی صورت	آج کے لیے سبق
مشاورت	مجلسِ شوریٰ، اہم فیصلوں میں اکابر سے مشورہ	فیصلہ سازی میں شرکت و شفافیت
عدل	قانون کا یکساں اطلاق، آزاد عدلیہ کی بنیاد	قانون کی حکمرانی سب سے اوپر
احتساب	اہلکاروں کے اثاثوں کی جانچ، عوامی سوال کا حق	جواب دہی کے بغیر اختیار خطرناک ہے
عوامی فلاح	بیت المال، وظائف، نہریں و سڑکیں، کمزوروں کی	ریاست کا اصل کام خدمت ہے

	کفالت	
قیادت قربانی مانگتی ہے عیاشی نہیں	سادہ زندگی، امانت داری، ہر فرد کی خبر گیری	حکمران کی ذمہ داری

عوامی فلاح اور حکمران کی ذمہ داری

عوامی فلاح کے میدان میں خلفائے راشدین نے فلاحی ریاست کی ابتدائی اور شاندار مثالیں قائم کیں۔ حضرت عمر کے دور میں بیت المال منظم ہوا، بچوں، بیواؤں اور معذوروں کے وظائف مقرر ہوئے، نئی نہریں کھدوائی گئیں، راستوں و پلوں کی حفاظت کا اہتمام ہوا اور قحط کے سال میں خلیفہ خود آرام چھوڑ کر عوام کی خدمت میں لگے رہے۔ ان کے مشہور قول کا مفہوم ہے کہ اگر دجلہ کے کنارے ایک کتا بھی بھوکا مر گیا تو انہیں خوف ہے کہ اس کے بارے میں ان سے سوال ہو گا۔ یہ جملہ حکمران کی ذمہ داری کے پورے فلسفے کا خلاصہ ہے۔ حضرت عثمان کے دور میں مالی وسعت کے باوجود مسجدِ نبوی کی توسیع اور کنویں وقف کرنے جیسے فلاحی کام ہوئے، اور حضرت علی کے دور میں بھی بیت المال کی تقسیم میں مساوات کو ترجیح دی گئی۔ ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ اسلامی حکمرانی میں ترقی کی تعریف صرف آمدنی کا اضافہ نہیں بلکہ سب سے کمزور فرد تک سہولت کی رسائی ہے۔

حکمران کی ذمہ داری کا تصور خلافت میں تین دائروں میں پھیلا ہوا ہے: اللہ کے سامنے جواب دہی، قانون کے سامنے جواب دہی اور عوام کے سامنے جواب دہی۔ اسی تین جہتی جواب دہی نے خلفائے راشدین کو اقتدار کے باوجود زاہد رکھا۔ حضرت ابو بکر نے اپنی پہلی تقریر میں واضح کیا تھا کہ اگر وہ درست راستے پر رہیں تو ان کی مدد کی جائے اور اگر بھٹکیں تو انہیں درست کیا جائے، اور ان کی اطاعت اسی وقت تک ہے جب تک وہ اللہ و رسول کی اطاعت پر قائم رہیں (خطبے کا مفہوم)۔ یہ اعلان گویا اس دور کا آئینی منشور تھا۔ آج کے دور میں اس اصول کی اہمیت مزید بڑھ گئی ہے، کیونکہ جہاں حکمران خود کو جواب دہی سے بالا سمجھے وہاں بدعنوانی اور ظلم پروان چڑھتا ہے۔ اسلامی سیاسی فکر اسی لیے حکمرانی کو اختیار نہیں ذمہ داری قرار دیتی ہے، اور خلفائے راشدین اس کی زندہ تفسیر ہیں۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ خلافت کا تصور اقتدار کو امانت، قانون کی بالادستی اور عوامی خدمت سے جوڑتا ہے، اور خلفائے راشدین نے مشاورت، عدل، احتساب، عوامی فلاح اور ذمہ داری کے اصولوں کو صرف نظریے تک محدود نہیں رکھا بلکہ عملی زندگی میں ثابت کر کے دکھایا۔ ان کے دور کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اچھی حکمرانی کے اصول ہر دور میں ایک جیسے رہتے ہیں: فیصلے مشورے سے، قانون سب کے لیے برابر، اہلکار جواب دہ، وسائل عوام کے لیے اور حکمران اپنے عمل کا خود نگران۔ موجودہ معاشروں کے لیے اس ماڈل کی اصل قدر اسی میں ہے کہ اسے نعرے کے بجائے اداروں کی صورت میں اپنایا جائے۔ یہ گائیڈ تعلیمی مقصد کے لیے ہے؛ کسی قانونی یا آئینی معاملے میں قطعی رائے متعلقہ ماہرین ہی کی معتبر ہے۔

سوال نمبر 2: اندلس کی اسلامی تہذیب اور یورپ پر اس کے اثرات

سوال نمبر 2: اندلس کی اسلامی تہذیب کے علمی، سائنسی، تعلیمی، ادبی اور فنی اثرات کا تجزیہ کریں اور واضح کریں کہ ان اثرات نے یورپ کی علمی و تہذیبی ترقی میں کن پہلوؤں سے کردار ادا کیا۔ (20 نمبر)

تعارف

اندلس یعنی مسلمانوں کا اسپین اسلامی تہذیب کے سنہرے ادوار میں سے ایک ہے۔ سن 711ء میں مسلمانوں کی آمد سے لے کر 1492ء میں غرناطہ کے زوال تک تقریباً آٹھ صدیوں پر محیط یہ دور اس خطے میں علم، فن اور تہذیب کی غیر معمولی ترقی کا دور تھا۔ قرطبہ، غرناطہ، اشبیلیہ اور طلیطلہ جیسے شہر اپنے زمانے میں علم و روشنی کے مراکز تھے جبکہ یورپ کا بڑا حصہ نسبتاً علمی جمود کا شکار تھا۔ اس سوال میں اندلس کی تہذیب کے علمی، سائنسی، تعلیمی، ادبی اور فنی اثرات کا تجزیہ کیا جائے گا اور پھر یہ واضح کیا جائے گا کہ ان اثرات نے یورپ کی علمی و تہذیبی ترقی میں کن پہلوؤں سے کردار ادا کیا۔ یہ تجزیہ اس لیے بھی اہم ہے کہ آج کا یورپ اپنی نشاۃِ ثانیہ کی جڑوں میں اندلس کی شراکت کو علمی حلقوں میں تسلیم کرتا ہے۔

علمی و تعلیمی اثرات

اندلس میں تعلیم کو معاشرے کی بنیاد بنا دیا گیا تھا۔ قرطبہ میں بڑی کتب خانے قائم تھے جن کے بارے میں مورخین لکھتے ہیں کہ خلیفہ کی لائبریری میں لاکھوں جلدیں موجود تھیں، اور عام لوگوں کے لیے بھی کتب تک رسائی نسبتاً آسان تھی۔ مساجد کے ساتھ مدارس قائم تھے، اور جامعات کی ابتدائی صورتیں قرطبہ میں نظر آتی ہیں جہاں فقہ، حدیث، طب، فلکیات، ریاضی اور ادب کی تعلیم دی جاتی تھی۔ تعلیمی نظام کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ عیسائی اور یہودی طلبہ بھی مسلمان اساتذہ سے علم حاصل کرتے تھے، جس سے بین المذاہب علمی تبادلے کا ماحول بنا۔ ابن رشد، ابن حزم، ابن باجہ اور زہراوی جیسے عظیم نام اسی ماحول کی پیداوار تھے۔ کاغذ سازی کی صنعت نے کتابوں کی اشاعت کو سستا اور عام کیا، جس کا اثر بعد میں پورے یورپ پر پڑا۔ تعلیمی اداروں میں لیکچر، مناظرہ اور اجازہ یعنی سند دینے کے نظام نے یورپی جامعات کے ابتدائی ڈھانچے کو متاثر کیا، اور محققین نظامِ اجازہ اور جدید ڈگری کے تصور میں تعلق بھی تلاش کرتے ہیں۔

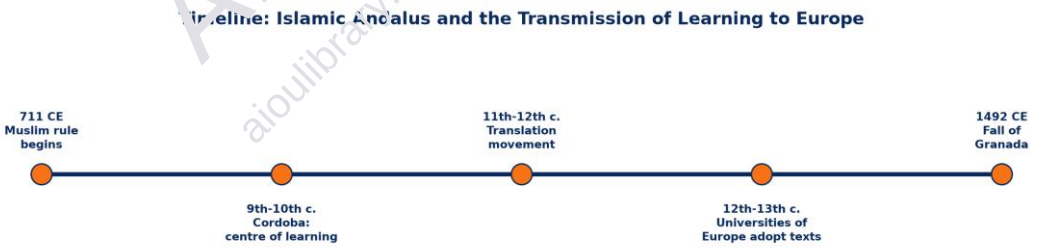

شکل 1: اسلامی اندلس کا تاریخی خط — فتوحات سے علمی ترسیل اور زوال تک۔

سائنسی اثرات

سائنس کے میدان میں اندلس کی خدمات حیران کن حد تک وسیع ہیں۔ طب میں ابوالقاسم الزہراوی کی کتاب التصریف جدید جراحی کی بنیادی کتابوں میں شمار ہوتی ہے جس میں جراحی کے آلات کی تصاویر اور طریقے درج ہیں؛ یہ کتاب صدیوں تک یورپ کی جامعات میں پڑھائی جاتی رہی۔ ابن رشد نے ارسطو کی شروح لکھ کر فلسفے اور طب دونوں کو متاثر کیا اور یورپ میں ان کا نام اویروس کے طور پر مشہور ہوا۔ فلکیات میں اندلسی ماہرین نے فلکی جداول میں اصلاح کی، رصد گاہی مشاہدات کو بہتر بنایا اور آلات میں جدت پیدا

کی۔ ریاضی میں صفر و ہندسوں کے نظام کی ترسیل، الجبرا کی ترقی اور مثلثات کی پیش رفت اندلس کے راستے یورپ پہنچی۔ زراعت میں مسلمانوں نے آب پاشی کے نئے نظام، نہروں اور نورئی یعنی رہٹ جیسے آلات متعارف کرائے اور چاول، گنا، زعفران، کھجور اور مالٹے جیسی فصلیں یورپ میں متعارف کیں جن سے وہاں کی زرعی معیشت بدل گئی۔ کیمیا، دواسازی اور نباتیات میں بھی اندلسی عالمان نے قابلِ قدر اضافے کیے، اور ان کی کتابوں کے لاطینی تراجم یورپی سائنس کی بنیاد بنے۔

ادبی و فنی اثرات

ادب میں اندلس نے عربی شاعری کو نئی صورتیں دیں۔ موشح اور زجل جیسی اصناف اندلس ہی میں ایجاد سمجھی جاتی ہیں جنہوں نے بعد میں یورپی رومانوی شاعری اور گانکوں یعنی ٹروبادور تحریک کو متاثر کیا؛ ماہرین لسانیات و ادبیات اس اثر کو دستاویزی شواہد کی روشنی میں بیان کرتے ہیں۔ ابن حزم کی کتاب طوق الحمامہ محبت کے موضوع پر عالمی ادب کی نمایاں کتابوں میں ہے۔ قصہ گوئی اور داستانوں کی ترسیل سے بھی یورپی ادب نے استفادہ کیا۔ فنِ تعمیر میں الحمرا محل، قرطبہ کی عظیم مسجد اور خیر الدا مینار عالمی ورثے کے نمونے ہیں؛ محراب کی نال نما صورت، خطاطی و جیومیٹری کی مزین کاری اور صحن و فواروں کا نظام بعد میں یورپی و نواستعماری تعمیرات میں جھلکتا رہا۔ موسیقی میں عود جیسے ساز اور مقاماتی دھنوں کی روایت اندلس سے یورپ منتقل ہوئی، اور زریاب جیسے موسیقار نے قرطبہ میں موسیقی کی باقاعدہ تعلیم کی بنیاد رکھی۔ کھانوں، لباس اور آدابِ معاشرت میں بھی اندلسی اثرات ہسپانوی ثقافت کا مستقل حصہ بن گئے، حتیٰ کہ ہسپانوی زبان میں عربی اصل کے ہزاروں الفاظ آج بھی اس تہذیبی لین دین کی زندہ گواہی دیتے ہیں۔

یورپ کی ترقی میں کردار: ترسیل کے راستے

اب اصل سوال یہ ہے کہ یہ اثرات یورپ تک پہنچے کیسے اور انہوں نے وہاں کی ترقی میں کیا کردار ادا کیا۔ پہلا راستہ ترجمے کی تحریک تھی۔ طلیطلہ کے زوال کے بعد وہاں قائم مکتبِ ترجمہ میں عربی کتب کا لاطینی میں ترجمہ بڑے پیمانے پر ہوا؛ جیرارڈ آف کریمونا جیسے مترجمین نے طب، فلکیات اور ریاضی کی درجنوں کتب منتقل کیں۔ دوسرا راستہ سسلی اور بحیرۂ روم کا تجارتی و ثقافتی رابطہ تھا۔ تیسرا راستہ صلیبی جنگوں اور تجارتی سفر تھا جس کے ذریعے یورپی اہلِ علم مشرقی علوم سے روشناس ہوئے۔ ان تراجم نے یورپ کو ارسطو کی

وہ شروح اور ابن سینا کی القانون جیسی کتابیں مہیا کیں جن پر یونیورسٹیوں کا نصاب قائم ہوا۔ یہاں تک کہ یورپی نشاۃِ ثانیہ کے بہت سے بنیادی خیالات کی تیاری اسی علمی ترسیل سے ہوئی: تجربے پر زور، مشاہدے کی اہمیت، اور یونانی ورثے کو تنقیدی شروح کے ساتھ پڑھنے کا انداز مسلمان علماء ہی کے ذریعے یورپ پہنچا تھا۔

ان اثرات کے نتائج بھی واضح ہیں۔ یورپی جامعات بولونیا، پیرس اور آکسفورڈ وغیرہ میں طب و فلکیات کے مضامین اندلسی و مشرقی کتب ہی کی بنیاد پر پڑھائے جاتے رہے۔ بحری جہاز رانی کے آلات، فلکی جداول اور نقشہ سازی میں بہتری اسی درآمدی کے دور کی راہ ہموار کی۔ شہری زندگی میں صفائی، روشنی اور بازاروں کے نظام میں قرطبہ جیسے شہروں کو نمونہ سمجھا جاتا تھا۔ تاہم تنقیدی دیانت کا تقاضا ہے کہ یہ کہا جائے کہ یورپ کی ترقی کا سبب صرف اندلس نہیں تھا؛ یورپ کے داخلی عوامل، یونانی ورثہ اور بعد کی اپنی محنت بھی شریک تھی۔ درست مؤقف یہی ہے کہ اندلس نے یورپ کی علمی ترقی کو صدیوں آگے دھکیل دیا اور اسے وہ بنیاد فراہم کی جس پر اس نے اپنی عمارت کھڑی کی۔ یہ اعتراف آج یورپی مورخین کے ایک بڑے طبقے میں پایا جاتا ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ اندلس کی اسلامی تہذیب نے علم، سائنس، تعلیم، ادب اور فن کے ہر میدان میں ایسی بلند سطح قائم کی جس کے اثرات سرحدیں عبور کر کے پورے یورپ تک پہنچے۔ کتب خانے و جامعات، طب و جراحی، فلکیات و ریاضی، شاعری و فنِ تعمیر، زراعت و زبان، ہر شعبے میں اندلسی شراکت کے شواہد موجود ہیں۔ یورپ کی علمی و تہذیبی ترقی میں اس کا کردار بنیاد فراہم کرنے، رفتار بڑھانے اور نئے دائرے کھولنے کا تھا۔ اس تاریخ کا سبق آج کے طالب علم کے لیے یہ ہے کہ علم کسی ایک قوم کی جاگیر نہیں ہوتا؛ جو قوم علم کی قدر کرتی ہے وہ دنیا کو روشنی دیتی ہے، اور جو اس سے غفلت کرتی ہے وہ اپنی ہی شاندار تاریخ کے سائے میں رہ جاتی ہے، جیسا کہ اندلس کا زوال خود سب سے بڑی عبرت ہے۔

سوال نمبر 3: اسلامی ثقافت میں لباس و تہوار اور جدید چیلنجز

سوال نمبر 3: اسلامی ثقافت میں لباس اور تہواروں کی نمایاں خصوصیات کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے واضح کریں کہ جدید دور میں اسلامی ثقافتی شناخت برقرار رکھنے میں ان روایات کو کن چیلنجز کا سامنا ہے۔ (20 نمبر)

تعارف

ثقافت کسی قوم کی اجتماعی شناخت کا آئینہ ہوتی ہے، اور لباس و تہوار اس شناخت کے سب سے زیادہ نظر آنے والے مظاہر ہیں۔ اسلامی ثقافت میں لباس محض جسم ڈھانپنے کا ذریعہ نہیں بلکہ حیا، وقار اور شناخت کا اظہار ہے، اور تہوار محض تفریح نہیں بلکہ شکر، عبادت اور سماجی ربط کا ذریعہ ہیں۔ جدید دور میں عالمگیریت، میڈیا اور فیشن کی صنعت نے ہر ثقافت کو بڑے چیلنجز سے دوچار کیا ہے، اور مسلمان معاشرے بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ اس سوال میں پہلے اسلامی ثقافت میں لباس اور تہواروں کی نمایاں خصوصیات کا تنقیدی جائزہ پیش کیا جائے گا، اور پھر یہ واضح کیا جائے گا کہ جدید دور میں اسلامی ثقافتی شناخت برقرار رکھنے میں ان روایات کو کن چیلنجز کا سامنا ہے، نیز ان چیلنجز سے نمٹنے کی ممکنہ صورتیں کیا ہو سکتی ہیں۔

اسلامی ثقافت میں لباس کی خصوصیات

اسلامی لباس کی پہلی خصوصیت ستر و حیا ہے۔ قرآن مجید میں لباس کا ذکر تقویٰ کے لباس کے ساتھ جوڑ کر اس کے اخلاقی پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے (مفہوم: سورۃ الاعراف، آیات 26 تا 27)، اور مرد و عورت دونوں کے لیے حد بندی مقرر کی گئی ہے۔ دوسری خصوصیت سادگی و اعتدال ہے: اسراف اور تکبر سے بچنے کی تعلیم دی گئی اور نمود و نمائش کے لباس سے منع کیا گیا۔ تیسری خصوصیت شناخت ہے: لباس سے مسلمان کی پہچان اس کی ثقافتی انفرادیت کو ظاہر کرتی ہے، مگر اس کے ساتھ علاقائی تنوع بھی برقرار ہے۔ پاک و ہند کا شلوار قمیض، عربوں کا جبہ، افریقی و جنوب مشرقی ایشیائی مسلمانوں کے روایتی انداز، یہ سب بتاتے ہیں کہ اسلام نے لباس کا یکساں ماڈل مسلط نہیں کیا بلکہ اصول دے کر

صورتوں میں وسعت رکھی۔ چوتھی خصوصیت صفائی و زیبائش کی ترغیب ہے: صاف ستھرا اور مناسب لباس پہننا پسندیدہ عمل ہے اور جمعہ و عید کے دن اچھا لباس پہننے کی ترغیب احادیث میں ملتی ہے۔ ان خصوصیات کا مجموعہ یہ ہے کہ اسلامی لباس بیک وقت اخلاقی قدر، معاشرتی آداب اور جمالیاتی ذوق کا امتزاج ہے۔

اسلامی تہواروں کی خصوصیات

اسلام کے دو بڑے تہوار عید الفطر اور عید الاضحیٰ ہیں۔ عید الفطر رمضان کے روزوں کے بعد شکر کا دن ہے جس میں فطرانہ دے کر غریبوں کو خوشی میں شریک کرنا لازم قرار دیا گیا ہے۔ عید الاضحیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کی یاد ہے جس میں قربانی کے گوشت کی تقسیم کے ذریعے ایثار کا درس ملتا ہے۔ ان تہواروں کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کی خوشی عبادت سے شروع ہوتی ہے: عید کی نماز کے بعد ملاقات و مبارک باد کا سلسلہ ہوتا ہے، یعنی تہوار کی بنیاد روحانیت پر ہے تفریح ثانوی ہے۔ دوسری خصوصیت سماجی انصاف ہے: فطرانہ اور قربانی کی تقسیم امیر کی خوشی کو غریب تک پہنچاتی ہے۔ تیسری خصوصیت خاندانی و سماجی رابطہ ہے: تہوار قبیلوں و دوستوں کے درمیان صلہ رحمی کو تازہ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ میلاد، شب برات اور محرم جیسی مناسبتوں کے بارے میں مسلمان معاشروں میں مختلف روایات پائی جاتی ہیں جن کا علمی و مذہبی جائزہ اہلِ علم اپنے اپنے مسلکی نقطۂ نظر سے کرتے ہیں؛ اس گائیڈ میں ان کا ذکر صرف اس حد تک ہے کہ یہ بھی سماجی زندگی کا حصہ ہیں اور ان کے بارے میں قطعی آراء مستند علماء ہی کے دائرے میں آتی ہیں۔

تنقیدی جائزہ

تنقیدی جائزہ لینے سے مراد یہ ہے کہ ان روایات کی خوبیوں کے ساتھ ان کمزوریوں کی بھی نشاندہی کی جائے جو عمل میں پیدا ہو گئی ہیں۔ پہلا نکتہ یہ ہے کہ بعض جگہ تہوار اصل مقصد یعنی عبادت و شکر سے ہٹ کر محض اسراف، نمود و نمائش اور مقابلے بازی کا ذریعہ بن گئے ہیں، حالانکہ ان کی روح قناعت و ایثار ہے۔ دوسرا نکتہ لباس کے بارے میں ہے کہ کہیں اسے محض شناختی نعرے میں بدل دیا گیا ہے اور اس کے اخلاقی مقاصد یعنی حیا و وقار پس پشت چلے گئے ہیں، اور کہیں اس کے برعکس لباس کے شرعی اصولوں کو کلیتاً ثقافتی فرسودگی کہہ کر رد کر دیا گیا ہے؛ دونوں انتہائیں توازن کے خلاف ہیں۔ تیسرا نکتہ یہ ہے کہ تہواروں پر تجارت کی موسمی مہم بعض اوقات غریب طبقے پر دباؤ بڑھا دیتی ہے، جو

تہواروں کے اصل جذبے کے منافی ہے۔ چوتھا نکتہ یہ ہے کہ سوشل میڈیا کے دور میں خوشی منانے کے بجائے خوشی دکھانے کا رجحان بڑھا ہے، جس سے تہوار کی سماجی و روحانی برکتیں کم ہو رہی ہیں۔ ان نکات کی نشاندہی اصلاح کے لیے ہے، روایات کی قدر کم کرنے کے لیے نہیں۔

جدید دور کے چیلنجز

جدید دور میں ان روایات کو کئی بڑے چیلنجز کا سامنا ہے۔ پہلا چیلنج عالمگیریت اور مغربی فیشن کی ہمہ گیر دسترس ہے۔ عالمی برانڈز اور فلم و ڈرامے کے ذریعے لباس کا ایک مخصوص عالمی نمونہ نوجوانوں کی ترجیح بن گیا ہے جس کے سامنے روایتی و دینی لباس کو فرسودہ ظاہر کیا جاتا ہے۔ دوسرا چیلنج میڈیا و سوشل میڈیا کا ہے، جہاں الگورتھم اسی مواد کو آگے بڑھاتے ہیں جو توجہ بٹورے، خواہ اس کا ثقافتی اثر کچھ بھی ہو۔ تیسرا چیلنج شناخت کا بحران ہے؛ مغربی ممالک میں مقیم مسلمانوں کے لیے حجاب و روایتی لباس پر بعض جگہ قانونی و سماجی دباؤ پایا جاتا ہے، جبکہ اپنے ملکوں میں بھی نوجوان نسل دینی شناخت اور جدید قبولیت کے درمیان کھنچی محسوس کرتی ہے۔ چوتھا چیلنج تہواروں کی تجارتی سازی ہے: عید کی تیاری اب اکثر خریداری کی دوڑ بن گئی ہے جس سے اس کی سادگی ختم ہو رہی ہے۔ پانچواں چیلنج خاندانی نظام کی کمزوری اور شہری مصروف زندگی ہے جس سے تہواروں کی اجتماعی صورت یعنی ملاقات و صلہ رحمی متاثر ہو رہی ہے۔ چھٹا چیلنج تعلیمی نظام میں اپنی ثقافت کی درست تدریس کی کمی ہے، جس سے بچے اپنی روایات کو دلائل کے ساتھ سمجھنے کے بجائے یا تو اندھی تقلید کرتے ہیں یا انہیں مکمل چھوڑ دیتے ہیں۔

شناخت برقرار رکھنے کی صورتیں

ان چیلنجز کا حل روایات ترک کرنے میں نہیں بلکہ انہیں حکمت کے ساتھ زندہ رکھنے میں ہے۔ پہلی صورت تعلیم و آگاہی ہے: بچوں کو لباس و تہوار کے مقاصد دلائل کے ساتھ سمجھائے جائیں تو شناخت ان پر بوجھ کے بجائے فخر بن جاتی ہے۔ دوسری صورت متوازن نمونہ پیش کرنا ہے: گھر کے بزرگ خود سادگی کے ساتھ تہوار منائیں اور اچھا مگر باحیا لباس اختیار کریں تو نوجوانوں کو عملی مثال ملتی ہے۔ تیسری صورت مثبت میڈیا کا استعمال ہے: اپنے تہواروں و روایات کی خوبصورتی کو معیاری انداز میں پیش کرنے سے دفاعی ردعمل کے بجائے مثبت شناخت بنتی ہے۔ چوتھی صورت روایات کی اصل روح کی حفاظت ہے: عید پر اسراف کے بجائے فطرانے و ایثار کو نمایاں کرنا، اور لباس میں نمائش کے

بجائے وقار کو معیار بنانا۔ پانچویں صورت دیگر ثقافتوں کے ساتھ مکالمہ ہے: غیر مسلم دوستوں کو عید کی مٹھائی بھیجنا یا اپنے تہوار کی وضاحت شائستگی سے کرنا شناخت کو کمزور نہیں، مضبوط کرتا ہے۔ ان تمام صورتوں میں بنیادی اصول یہ ہے کہ شناخت نفرت یا احساسِ کمتری سے نہیں، علم، اخلاق اور پر اعتماد عمل سے قائم رہتی ہے۔

نتیجہ

نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی ثقافت میں لباس حیا، وقار، سادگی اور شناخت کا ذریعہ ہے اور تہوار عبادت، شکر، ایثار اور صلہ رحمی کا نظام ہیں۔ ان روایات کی اصل کمزوری ان کے اصولوں میں نہیں بلکہ کبھی کبھی ہمارے عمل میں پیدا ہونے والے اسراف، نمائش اور بے روح رسم پرستی میں ہے۔ جدید دور کے چیلنجز — عالمگیریت، میڈیا، فیشن انڈسٹری، تجارتی سازی اور شناخت کا بحران — حقیقی ہیں مگر ناقابلِ حل نہیں۔ تعلیم، متوازن نمونے، اصل روح کی حفاظت اور مثبت مکالمے کے ذریعے اسلامی ثقافتی شناخت کو نئے دور میں بھی وقار کے ساتھ برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ شناخت کی حفاظت کا بہترین طریقہ اپنی روایات کو سمجھ کر جینا ہے، نہ کہ ہیں نعرہ مانا اور نہ ان سے شرمندہ ہونا۔

سوال نمبر 4: مسلمان ماہرینِ کیمیا، سائنسی طریقہ اور ایک جدید کیمیائی مسئلہ

سوال نمبر 4: مسلمان ماہرین کیمیا کی خدمات اور سائنسی طریقہ تحقیق کے اصولوں کی روشنی میں کسی ایک جدید کیمیائی مسئلے یا شعبے کا انتخاب کریں اور واضح کریں کہ مسلم سائنس دانوں کے تحقیقی منہج سے اس مسئلے کے حل کے لیے کیا رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ (20 نمبر)

تعارف

کیمیا ان علوم میں سے ہے جن کی جدید صورت کی تشکیل میں مسلمان سائنس دانوں کا کردار بنیادی تسلیم کیا جاتا ہے۔ آٹھویں سے چودھویں صدی عیسوی کے درمیان مسلم ماہرین نے کیمیا کو جادو ٹونے اور خفیہ رسائل کی دنیا سے نکال کر تجربے، پیمائش اور درجہ بندی کا باقاعدہ علم بنایا۔ اس سوال میں پہلے مسلمان ماہرینِ کیمیا کی نمایاں خدمات اور ان کے سائنسی طریقۂ تحقیق کے اصول بیان کیے جائیں گے، اور پھر ایک جدید کیمیائی مسئلہ یعنی پانی کی کیمیائی آلودگی کا انتخاب کر کے واضح کیا جائے گا کہ مسلم سائنس دانوں کے

تحقیقی منہج سے اس مسئلے کے حل کے لیے کیا رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہ موضوع اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ پاکستان سمیت دنیا بھر میں صاف پانی کی فراہمی آج کا سنگین مسئلہ ہے اور کیمیا اس کے حل کی کنجی رکھتی ہے۔

مسلمان ماہرینِ کیمیا کی نمایاں خدمات

مسلم کیمیا کی تاریخ کا سب سے بڑا نام جابر بن حیان کا ہے جنہیں مغرب میں گبر کے نام سے جانا جاتا ہے اور جنہیں جدید کیمیا کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان سے منسوب تحریروں میں تیزابوں کی تیاری و شناخت، عملِ تعریق، عملِ تبخیر، کشید اور تکلیس جیسے تجرباتی عمل کی باقاعدہ وضاحت ملتی ہے، اور تجربہ گاہ کے آلات کی باقاعدہ تفصیل بھی انہی کی روایت سے جڑی ہے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے تجربے کو علم کا معیار بنایا اور بغیر تجربے کے دعووں کو غیر معتبر قرار دیا۔ دوسرے بڑے ماہر محمد بن زکریا الرازی ہیں جن کی کتاب کتاب الاسرار میں مادوں کی درجہ بندی، آلات کی فہرست اور تجربات کو اس وضاحت کے ساتھ درج کیا گیا ہے کہ آج کا قاری بھی انہیں دہرا سکے۔ الرازی نے اسپرٹ اور الکحل کی کیمیائی تیاری و استعمال میں پیش رفت کی اور الکیمیائی نظریات کو عملی و علمی کیمیا کی طرف موڑا۔ ان کی تجربہ پسندی اور کیمیائی عمل کے دوران احتیاطی مشاہدہ جدید لیبارٹری طریقے کی ابتدائی جھلک ہے۔

ان کے علاوہ الکندی نے خوشبوؤں اور عطریات کی کیمیا پر کتاب لکھی جس میں مرکبات کی تیاری کے نسخے درج ہیں، ابن سینا نے معدنیات و ادویات کے کیمیائی خواص پر بحث کی اور جعلی سونا بنانے جیسے دعووں کی علمی تردید بھی کی جو ان کی تنقیدی سوچ کا ثبوت ہے۔ اندلس میں الزہراوی نے طبی و جراحی کیمیا کو آگے بڑھایا اور عباس بن فرناس جیسے ماہرین نے بھی عملی تجربات کیے۔ ایک مجموعی خدمت یہ بھی ہے کہ مسلم ماہرین نے یونانی، فارسی اور ہندی علوم کو عربی میں منتقل کر کے ان میں اضافہ کیا، اور پھر یہ علم اندلس کے راستے لاطینی تراجم کے ذریعے یورپ پہنچا۔ الکحل، الکلی، کافور اور ایلمبک جیسے الفاظ کی عربی اصل آج بھی اس ترسیل کی گواہی دیتی ہے، القدیم سے لے کر جدید کیمیائی ناموں تک یہ اشارے اس علمی ورثے کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ طالب علم کے لیے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ مسلم کیمیا کی عظمت صرف انفرادی دریافتوں میں نہیں بلکہ اس طریقے میں ہے جو انہوں نے دنیا کو دیا۔

تحقیقی منہج: اصول و خصوصیات

مسلم سائنس دانوں کے تحقیقی منہج کے بنیادی اصول درج ذیل ہیں۔ پہلا اصول تجربہ اور مشاہدہ ہے: کسی شے کی خاصیت کتاب میں پڑھنے کے بجائے تجربہ کر کے جانچی جائے۔ دوسرا اصول درست ناپ تول ہے: الرازی اور دیگر ماہرین وزن و پیمائش کو تجربے کی شرط قرار دیتے تھے، کیونکہ مقدار کے بغیر نتیجہ قابلِ اعتماد نہیں ہوتا۔ تیسرا اصول مادوں کی درجہ بندی ہے: خواص کی بنیاد پر جماعت بندی سے موازنہ اور پیش گوئی ممکن ہوئی۔ چوتھا اصول نتائج کی تحریری دستاویز ہے: تجربہ اس انداز سے لکھا جائے کہ دوسرا محقق اسے دہرا کر تصدیق کر سکے، یہ اصول آج کی سائنس میں قابلِ تکرار کا نام سے جانا جاتا ہے۔ پانچواں اصول غلطیوں کا اعتراف اور اصلاح ہے: ابن سینا کی طرف سے ناممکن دعوؤں کی تردید اسی مزاج کا اظہار ہے۔ چھٹا اصول علم کا مقصد انسانی خدمت ہے: مسلم ماہرین کے نزدیک کیمیا کا اصل میدان طب، دواسازی اور صنعت تھا، دولت کے لالچ کو انہوں نے اس علم کی بدنامی قرار دیا۔ ساتواں اصول امانتِ حوالہ ہے: پیش روؤں کی خدمات کا اعتراف اور ان کے نام کے ساتھ نقل اس روایت کا حصہ تھا۔ یہ تمام اصول جدید سائنسی طریقے سے گہرے مشابہ ہیں، اسی لیے مسلم کیمیا کو جدید کیمیا کی پیش رو کہا جاتا ہے۔

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

Figure: The Experimental Scientific Method

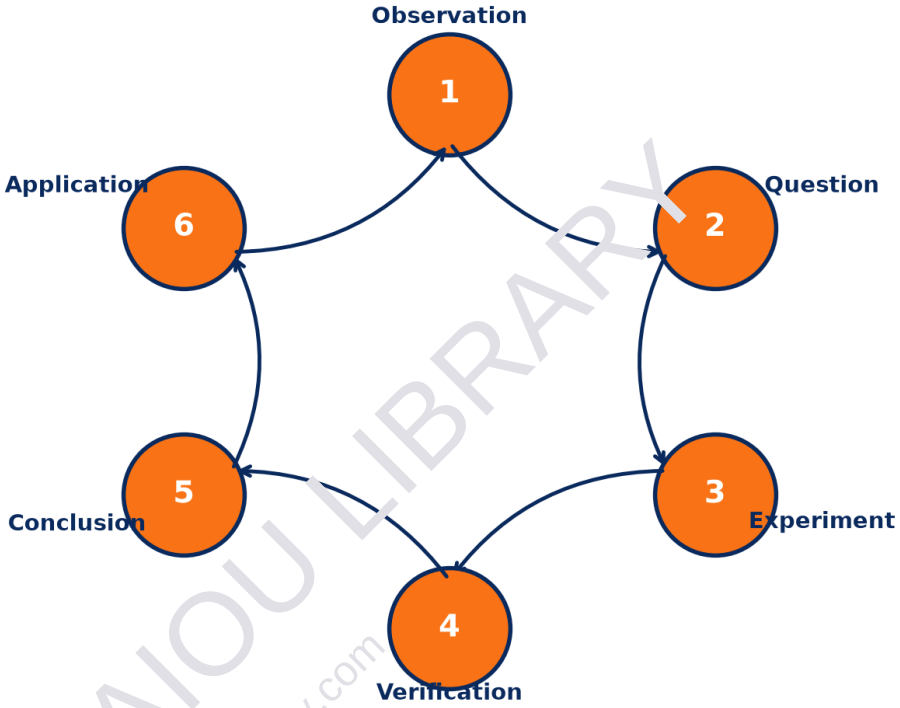

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

شکل 1: سائنسی طریقۂ تحقیق کا چکر — مشاہدے سے تجربے، تصدیق اور عملی اطلاق تک۔

منتخب جدید مسئلہ: پانی کی کیمیائی آلودگی

اس سوال کے لیے منتخب جدید مسئلہ پانی کی کیمیائی آلودگی ہے۔ پاکستان کے کئی شہروں میں زیرِ زمین پانی میں آرسینک، سیسہ، نائٹریٹ اور صنعتی فضلے کے کیمیائی اجزاء خطرناک حد تک پائے گئے ہیں۔ صنعتی اکائیوں کا غیر صاف شدہ فضلہ دریاؤں میں ڈالنا، زراعت میں کھادوں و کیڑے مار ادویات کا بے تحاشا استعمال، اور پرانے پائپوں سے زنگ و سیسے کا پانی میں شامل ہونا اس مسئلے کی بڑی وجوہات ہیں۔ اس آلودگی سے گردوں و جگر کی بیماریاں، بچوں کی ذہنی نشو و نما میں کمی اور کینسر جیسے امراض کے خطرات بڑھتے ہیں۔ اس مسئلے کا تعلق براہِ راست کیمیا سے ہے، کیونکہ آلودہ اجزاء کی شناخت، مقدار کی پیمائش، انہیں دور کرنے کے کیمیائی و طبیعی طریقے اور صاف پانی کی جانچ، سب کیمیا دان ہی کا کام

ہے۔ عالمی ادارہ صحت کے معیارات کے مطابق پانی میں ہر آلودہ جزو کی آخری حد مقرر ہے، اور لیبارٹری میں پانی کا باقاعدہ تجزیہ کیے بغیر یہ جاننا ممکن نہیں کہ پانی محفوظ ہے یا نہیں۔

مسلم تحقیقی منہج سے رہنمائی

اب دیکھنا یہ ہے کہ مسلم سائنس دانوں کے منہج سے اس مسئلے کے حل میں کیا رہنمائی ملتی ہے۔ پہلی رہنمائی تجربہ گاہی جانچ کی اولیت ہے۔ جس طرح جابر بن حیان ہر دعوے کو تجربے کی کسوٹی پر پرکھتے تھے، اسی طرح پانی کی حفاظت کے بارے میں بھی اندازوں کے بجائے علاقہ وار نمونے لے کر باقاعدہ لیبارٹری تجزیہ کرنا ہوگا۔ ہمارے ہاں پانی کے مسئلے پر بحث اکثر اندازوں پر ہوتی ہے؛ منہج یہ سکھاتا ہے کہ پہلے ناپو، پھر فیصلہ کرو۔ دوسری رہنمائی درجہ بندی اور دستاویز کی ہے۔ الرازی کے انداز میں آلودہ اجزاء کی علاقائی فہرستیں اور نقشے مرتب کیے جائیں تاکہ معلوم ہو کہ کہاں مسئلہ آرسینک کا ہے اور کہاں صنعتی فضلے کا، کیونکہ ہر مسئلے کا علاج الگ ہے۔ تیسری رہنمائی قابلِ تکرار تصدیق ہے: ایک لیبارٹری کے نتیجے پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ آزادانہ دوبارہ جانچ کا نظام رکھا جائے، تاکہ رپورٹوں کی ساکھ قائم ہو۔

چوتھی رہنمائی حل میں عملیت اور کم خرچ مقامی ٹیکنالوجی کی تلاش ہے۔ مسلم ماہرین نے ہمیشہ دستیاب وسائل سے کام لیا؛ اسی اصول پر آج بائیو ریت کے فلٹر، چونا پتھر و چارکول کے مقامی فلٹر اور دھوپ سے جراثیم کشی جیسے سستے طریقے دیہی علاقوں کے لیے تیار کیے جاسکتے ہیں، بشرطیکہ ان کی کارکردگی تجربے سے ثابت کی جائے نہ کہ دعووں سے۔ پانچویں رہنمائی علم کا مقصد خدمت ہے: کیمیادان کی ذمہ داری صرف مقالہ لکھنا نہیں بلکہ صنعت کو فضلہ صاف کرنے کی پابندی کی طرف لانا، حکومت کو معیاری رپورٹ مہیا کرنا اور عوام کو سادہ الفاظ میں آگاہی دینا بھی ہے۔ چھٹی رہنمائی اخلاقی دیانت ہے: پانی کی رپورٹ میں کسی دباؤ پر تبدیلی کرنا اسی خیانت کے مترادف ہے جس سے مسلم ماہرین بچتے تھے۔ ان رہنمائیوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جدید مسئلے کا حل جدید آلات سے ہوگا، مگر اس حل کی سمت، دیانت اور ترتیب مسلم تحقیقی منہج سے اختیار کی جاسکتی ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں تاریخِ سائنس محض ماضی نہیں رہتی، حال کا نقشہ بن جاتی ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ جابر بن حیان، الرازی، الکندی اور ابن سینا جیسے مسلمان ماہرینِ کیمیا نے تجربہ، پیمائش، درجہ بندی، دستاویز اور خدمتِ انسانیت کے اصولوں پر کیمیا کی وہ بنیاد رکھی جس پر جدید کیمیا کھڑی ہے۔ پانی کی کیمیائی آلودگی جیسے جدید مسئلے کے حل میں ان اصولوں سے براہِ راست رہنمائی ملتی ہے: پہلے درست پیمائش، پھر درجہ بندی و نقشہ سازی، پھر تصدیق شدہ اور مقامی طور پر قابلِ عمل حل، اور سب سے بڑھ کر عوام کی خدمت اور رپورٹ کی دیانت۔ اگر ہمارے تعلیمی ادارے طالب علموں کو کیمیا کے ساتھ اس کا تحقیقی منہج اور تاریخی پس منظر بھی پڑھائیں، تو سائنس ان کے لیے مغربی درآمد کے بجائے اپنے ہی ورثے کی توسیع محسوس ہو گی، اور یہی احساس تحقیق کی اصل توانائی پیدا کرتا ہے۔

سوال نمبر 5: عربی زبان کی تاریخی، دینی و تہذیبی اہمیت

سوال نمبر 5: عربی زبان کی تاریخی، دینی اور تہذیبی اہمیت کو باہم مربوط کرتے ہوئے ایک جامع تجزیاتی خاکہ تشکیل دیں جس میں اسلامی علوم، ادب، تہذیب اور جدید علمی دنیا میں عربی زبان کے کردار کو یکجا کر کے واضح کیا گیا ہو۔ (20 نمبر)

تعارف

عربی دنیا کی ان چند زبانوں میں سے ہے جنہوں نے نہ صرف ایک قوم کی شناخت بنائی بلکہ ایک پورے مذہب، ایک عالمی تہذیب اور صدیوں کے علمی ورثے کی امین بھی بنیں۔ آج عربی تیئیس کے قریب ملکوں کی سرکاری زبان ہے، کروڑوں لوگوں کی مادری زبان ہے اور دنیا بھر کے مسلمانوں کی مذہبی زبان ہونے کی حیثیت سے اس کا دائرہ اس سے کہیں وسیع ہے۔ اس سوال میں عربی زبان کی تاریخی، دینی اور تہذیبی اہمیت کو باہم مربوط کر کے ایک جامع تجزیاتی خاکہ تشکیل دیا جائے گا، اور اسلامی علوم، ادب، تہذیب اور جدید علمی دنیا میں اس کے کردار کو یکجا کر کے واضح کیا جائے گا۔ اس خاکے کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ عربی محض ماضی کی زبان نہیں بلکہ حال کی زندہ قوت اور مستقبل کی علمی ضرورت بھی ہے۔

تاریخی اہمیت

تاریخی طور پر عربی کا شمار سامی زبانوں کے خاندان سے ہے اور جزیرۂ عرب میں اس کی مختلف لہجاتی صورتیں صدیوں سے موجود تھیں۔ اسلام سے قبل ہی عربی شاعری اپنی بلند سطح تک پہنچ چکی تھی اور المعلقات جیسے قصائد اس دور کی ادبی عظمت کی گواہی دیتے ہیں۔ اسلام کے ظہور کے بعد عربی نے غیر معمولی وسعت اختیار کی: فتوحات کے ساتھ یہ زبان عرب سے نکل کر شام، عراق، مصر، شمالی افریقہ اور اندلس تک پھیل گئی اور محض قبائلی زبان سے نکل کر سائنس، قانون اور حکمرانی کی بین الاقوامی زبان بن گئی۔ خلافتِ عباسیہ کے دور میں بغداد علم کا مرکز بنا اور یونانی، فارسی و ہندی علوم عربی میں منتقل ہوئے۔ اسی دور میں خلیل بن احمد نے لغت و عروض اور سیبویہ نے نحو کی بنیادیں قائم کیں۔ آٹھ سو سال تک عربی علم کی وہ عالمی زبان رہی جس طرح آج انگریزی ہے۔ اردو سمیت فارسی ترکی سواحلی، ملیالم اور ہسپانوی تک بہت سی زبانوں نے عربی سے الفاظ، رسم الخط یا علمی اصطلاحات لیں؛ اردو کا رسم الخط اور اس کی دینی و ادبی لغت کا بڑا حصہ عربی ہی کی دین ہے۔

دینی اہمیت

عربی کی دینی اہمیت اس حقیقت سے قائم ہے کہ قرآن مجید عربی میں نازل ہوا، اور قرآن نے خود کو عربی قرآن کے طور پر متعارف کرایا ہے (مفہوم: سورۃ یوسف، آیت 2؛ سورۃ الشوریٰ، آیت 7)۔ نماز، اذان، حج کے مناسک اور روزمرہ کی مسنون دعائیں عربی ہی میں ادا ہوتی ہیں، اس لیے دنیا کے ہر خطے کا مسلمان کم از کم اس بنیادی عربی سے ضرور وابستہ رہتا ہے۔ احادیث، فقہ، تفسیر اور اصول کے پورے علمی خزانے کی اصل زبان عربی ہے؛ تراجم مددگار ضرور ہیں مگر اصل مفہوم کی گہرائی اور فقہی استدلال کی باریکیاں عربی جانے بغیر مکمل حاصل نہیں ہوتیں۔ اسی وجہ سے مسلمانوں کے تعلیمی اداروں میں چودہ صدیوں سے عربی کو نصاب کا لازمی حصہ رکھا گیا ہے۔ دینی اہمیت کا دوسرا پہلو اتحاد کا ہے: بنگلہ دیش سے مراکش تک مسلمان نماز میں ایک ہی زبان بولتے ہیں، جو امت کے عالمی ربط کی سب سے بڑی عملی علامت ہے۔ طالب علم کے لیے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ عربی سیکھنا ایک علمی مہارت سے بڑھ کر اپنے دینی ورثے سے براہِ راست تعلق قائم کرنا ہے۔

تہذیبی اہمیت وادب میں کردار

تہذیبی سطح پر عربی نے ایک پوری تمدنی فضا کو زبان دی۔ اسلامی فنِ تعمیر کی خطاطی، کتب کی تزئین، علمی مجالس کی گفتگو اور قانونی دستاویزات، ہر جگہ عربی مرکز میں رہی۔ خطاطی کا فن عربی حروف کی خوبصورتی سے پیدا ہوا اور مساجد و محلات کی زینت بنا۔ ادب میں عربی کا کردار غیر معمولی ہے: جاہلی قصیدے سے لے کر عباسی دور کے نثر و نظم، الف لیلہ کی داستانوں سے لے کر ابن خلدون کے مقدمے تک، عربی ادب نے عالمی ادب کو کردار، اسلوب اور موضوعات دیے۔ اندلس کی عربی شاعری نے یورپی ادب کو متاثر کیا اور عربی علمی نثر نے فلسفہ، تاریخ، جغرافیہ اور طب میں ایسی کتابیں پیدا کیں جن کے تراجم صدیوں تک یورپ میں پڑھائے گئے۔ لغت نویسی اور صرف و نحو کی تدوین نے زبان کو وہ ضبط دیا جس کی وجہ سے چودہ سو سال پرانی عربی تحریر آج بھی قابلِ فہم ہے، یہ استحکام دنیا کی کم زبانوں کو حاصل ہے۔ الفاظ کی وسعت یعنی ایک ہی شے کے متعدد نام، اور اشتقاق کا نظام یعنی اصل حرفوں سے لفظ سازی کی صلاحیت، عربی کو علمی اصطلاحات بنانے کی غیر معمولی طاقت دیتی ہے۔

جدول 1: عربی زبان کے کردار کا جامع خاکہ

شعبہ	عربی زبان کا کردار	نمایاں مثال / مظہر
اسلامی علوم	قرآن، حدیث، فقہ و تفسیر کی اصل زبان	نماز و اذان کی عالمی یکسانی
علوم و سائنس	صدیوں تک عالمی علمی زبان؛ تراجم کا ذریعہ	طبی و فلکی کتب کے لاطینی تراجم
ادب	شاعری، داستان و نثر کی عالمی روایت	المعلقات، الف لیلہ، اندلسی موشح
تہذیب و فن	خطاطی و فنِ تعمیر کی بنیاد	مساجد کی خطاطی و کتب کی تزئین
دیگر زبانیں	الفاظ و رسم الخط کا اثر	اردو، فارسی، ہسپانوی میں عربی الفاظ
جدید دنیا	اقوامِ متحدہ کی سرکاری زبان؛ میڈیا و ترجمہ	بین الاقوامی نشریات و سفارت کاری

جدید علمی دنیا میں کردار

جدید دور میں بھی عربی کی اہمیت ختم نہیں ہوئی بلکہ کئی نئے رنگ اختیار کر گئی ہے۔ اقوامِ متحدہ نے عربی کو اپنی چھ سرکاری زبانوں میں شامل کیا ہوا ہے، جس سے سفارت کاری و بین الاقوامی قانون میں اس کی حیثیت مسلم ہے۔ عرب دنیا کی معاشی قوت، توانائی کے وسائل اور جغرافیائی اہمیت کی وجہ سے ترجمہ، صحافت، تجارت اور بین الاقوامی تعلقات میں عربی ماہرین کی مانگ مسلسل بڑھ رہی ہے۔ تعلیمی میدان میں دنیا کی بڑی جامعات میں عربی مطالعات کے شعبے قائم ہیں اور مخطوطات کی تحقیق سے آج بھی سائنس و طب کی تاریخ کو نئے شواہد مل رہے ہیں۔ ڈیجیٹل دور میں عربی مواد کی مقدار میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے، اگرچہ انگریزی کے مقابلے میں اس کا تناسب ابھی کم ہے؛ یہی کمی نوجوانوں کے لیے موقع بھی ہے کہ وہ معیاری عربی علمی مواد تخلیق کریں۔ پاکستان کے لیے عربی کی خاص اہمیت یہ ہے کہ خلیجی ممالک میں لاکھوں پاکستانی کارکن کام کرتے ہیں، دینی تعلیم کا بنیادی ورثہ عربی میں ہے اور اردو کی بہتری خود عربی کی سمجھ سے جڑی ہے۔ ان اسباب کی بنا پر عربی کو محض مذہبی ضرورت سمجھنا اس کی اصل وسعت کو کم کرنا ہے۔

تجزیاتی ربط: تاریخ، دین اور تہذیب کا اتصال

اس پورے خاکے کا تجزیاتی نکتہ یہ ہے کہ عربی کی تاریخی، دینی اور تہذیبی اہمیت آپس میں گندھی ہوئی ہے۔ دین نے زبان کو مقدس حیثیت اور عالمی وسعت دی، تاریخ نے اسے سلطنت و سائنس کی زبان بنایا، اور تہذیب نے اسے فن و ادب کی خوبصورتی عطا کی۔ اگر دین کا پہلو نہ ہوتا تو عربی بھی دیگر علاقائی زبانوں کی طرح محدود رہتی؛ اگر علمی و تہذیبی پہلو نہ ہوتا تو یہ محض عبادت کی زبان بن کر رہ جاتی۔ اسی امتزاج نے اسے چودہ صدیوں تک زندہ و فعال رکھا۔ البتہ تنقیدی ایمانداری کا تقاضا ہے کہ موجودہ کمزوریوں کا بھی ذکر ہو: مسلمانوں کے کئی ملکوں میں عربی تدریس کا طریقہ رٹے اور ترجمے تک محدود رہا ہے جس سے طلبہ برسوں پڑھنے کے باوجود زبان بولنے و لکھنے پر قادر نہیں ہوتے، اور جدید علوم میں عربی اصطلاح سازی و ترجمے کی رفتار بھی سست ہے۔ ان کمزوریوں کا حل زبان سے دوری نہیں بلکہ تدریس کی اصلاح، براہِ راست مہارت پر زور اور جدید مواد کی تیاری ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ عربی زبان تاریخی اعتبار سے سامی روایت کی عظیم وارث، دینی اعتبار سے قرآن وعبادات کی زبان، تہذیبی اعتبار سے خطاطی وادب کی بنیاد، اور جدید دنیا میں سفارت، تجارت، میڈیا و تحقیق کی زندہ ضرورت ہے۔ اس کا کردار اسلامی علوم سے لے کر عالمی ادب تک اور بغداد و اندلس کی جامعات سے لے کر اقوام متحدہ کے ایوانوں تک پھیلا ہوا ہے۔ جامع خاکے سے یہ بھی واضح ہوا کہ اس کی قوت کا راز اس کے تینوں پہلوؤں کے اتصال میں ہے۔ آج کے طالب علم کے لیے اس کا عملی مطلب یہ ہے کہ عربی سیکھنا ماضی کی زیارت نہیں بلکہ اپنے دین، اپنی زبان اردو اور اپنے پیشہ ورانہ مستقبل [illegible] مایہ کاری ہے۔ جو قوم اپنی علمی زبان سے جڑی رہتی ہے، اس کی فکر میں گہرائی اور اس کی شناخت میں اعتماد باقی رہتا ہے۔

AIOU LIBRARY aioulibrary.com